پندرہ روزہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علیگ

• علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔
• ہر مہینہ کی ۵ اور ۲۰ کو شائع ہوتا ہے۔

فی پرچہ ۔ ۱۲ نئے پیسے (۲؍)
ششماہی ۔ ۔ ۱؍

دوسرا سال جلد ۲ | ۵ ستمبر ۱۹۵۷ء | نمبر ۴

"اجتماعی زندگی"

علی گڑھ کی شان امتیاز ہمیشہ سے یہاں کی اجتماعی زندگی رہی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں بہت سے تعلیمی ادارے ہیں، ان میں سے اکثر کا معیار تعلیم علیگڑھ سے اچھا ہو سکتا ہے کچھ ایسے ہیں جو نئے تعلیمی تجربات کرنے میں مصروف ہیں۔ بعض اپنے دامن میں خوبصورت اور حسین و جمیل عمارتیں رکھتے ہیں لیکن جب طلبار کی اجتماعی زندگی کا ذکر آتا ہے تو علی گڑھ کی الگ ہی شان نظر آتی ہے۔ ہماری یونیورسٹی ایک اقامتی ادارہ ہے جہاں تعلیم سے زیادہ زور مل جل کر رہنے اور اس طرح ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے پر دیا جاتا ہے ہمیشہ سے یہاں ایک مختصر تعداد کو ہوسٹل سے باہر رہنے کی اجازت ہے۔ اور وہ بھی محض مجبوری میں۔

جب طالب علم اپنے گھر میں ہوتا ہے تو ماں باپ، بہن بھائی اس کے ناز بردار ہوتے ہیں، وہ اپنے گھر کے مروجہ طریقوں اور ضابطوں کے مطابق رہتا ہے لیکن ہوسٹل میں آکر اسے ایک نئی زندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں ہر شخص غیر ہوتا ہے خواہ وہ ہر دوست ہو یا اس کا روم میٹ۔ یہاں وہ سب کے برابر ہوتا ہے کسی سے بڑا نہیں ہوتا۔ وہ محض ضد سے کوئی بات منوا نہیں سکتا اور محض غصہ سے کسی پر رعب نہیں ڈال سکتا۔ یہاں اسے اگر کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے تو بہت کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ یہاں اسے اگر کسی ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے خود بھی دوسروں کا غمگسار بننا پڑتا ہے۔ اور علی گڑھ کی اجتماعی زندگی میں اس طرح رہنے اور بسنے کے سارے راز منکشف ہو جاتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف خود ان حضرات کو بھی ہے جو دوسرے اداروں سے علیگڑھ آئے کہ علی گڑھ میں طلبار جس محبت اور خلوص سے رہتے ہیں اس کی مثال کسی ادارے میں نہیں ملتی۔ یہاں وہ غیر طلبار اور علی گڑھ کی گود میں آتے ہیں تو ان کا تعلق سگے بھائیوں جیسا ہو جاتا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ یہاں کی زندگی سے ہر غیریت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور یہاں امیر اور غریب، شمالی اور جنوبی ہندوستانی اور مسلم کے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں پھر تمام طلبار ایک ہیں جن کا ایک نصب العین اور ایک ہی راستہ ہے۔

اگر کسی کے پاس چائے کے لئے پیسے نہیں تو وہ دوسرے کا مہمان ہے۔ کسی کے منی آرڈر میں دیر ہے تو دوسروں کی جیبیں حاضر ہیں۔ کسی پر Dues ہیں اور اس کا کھانا بند ہو گیا تو اس پر سترہ دروازے کھل گئے۔ غرض یہاں اگر کوئی غریب ہے تو اس سے NEXTDOOR NEIGHBOUR کو بھی احوال واقعی کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنے ساتھیوں کے خلوص و محبت کے سہارے اپنا تعلیمی زمانہ باطمینان گزار لیتا ہے علی گڑھ کی زندگی کا یہی سبق ہے جسے کوئی نہیں بھولتا۔

اگر ایک طرف طلبار کا آپس کا یہ تعلق ہے تو دوسری طرف طلبار اور اساتذہ کا تعلق بھی بڑا عجیب ہے۔ وائس چانسلر سے لیکر جونیر لکچرر تک جب طلبار سے ملتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دوست ہیں، اور اگر کہیں گھروں پر چلے جائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاگرد کہیں اپنے استادوں کا بزرگ تو نہیں۔ کلاس میں اور کلاس سے ہٹ کر گھروں پر امتحانات سے پہلے اور عین امتحان کی راتوں میں اٹھتے اور بیٹھتے طلبار کو ہر وقت اپنے اساتذہ پر اختیار ہے۔ تعلیمی میدان کیا خود طلبار کی ذاتی زندگی کے معاملات اور ان کی ضرورتیں سب ان اساتذہ کے مشوروں سے طے پا جاتی ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں کتنے ایسے اساتذہ ہیں جن کی پوری پوری تنخواہیں طلبار کی ضمانتیں لینے اور ان کو مالی امداد دینے میں ختم ہو جاتی ہیں۔

ہمارے ادارہ کا یہ کردار رہا ہے لیکن آج ہمیں اس کردار کی کل سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ کردار سر سید کے عظیم تعلیمی تجربہ کا ایک پہلو ہے۔ انہوں نے اس ادارہ کی بنیاد ہی اس طرح ڈالی کہ یہ درسگاہ ایک بڑا خاندان معلوم ہو۔ نہ کہ طلبار کی منڈی۔ طلبار اور اساتذہ کے گہرے تعلق اور طلبار کے آپس کے اظہار ہمدردی کی یہ رسم سر سید کے وقت سے چلی آتی ہے۔ خود اس ادارہ کے قیام کا منشا یہ بھی تھا کہ ہندوستان اور دنیا کے مختلف گوشوں سے طلبا آئیں اور ایک دوسرے کو سمجھیں۔ سر سید کے اس طرز عمل کا مقصد وہی تھا جو پوری اس علی گڑھ تحریک کا تھا یعنی نوجوانوں کو آنے والے دور کا باعمل انسان بنانا نہ کہ ماضی کے مندر کا بے لوث پجاری۔

سب سے پہلے تو یہاں کے انٹروڈکشن میں نئے آنے والے طلبار سے غیریت کے پردے اٹھ جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انٹروڈکشن کے اس طریقہ میں بعض معیوب پہلو تھے۔ مگر ہمیں نفس انٹروڈکشن سے مطلب ہے نہ کہ اس کے غلط

طریقہ کار سے INTRODUCTION کے طریقہ کو آج یونیورسٹی سے اس طرح اُڑا دیا گیا ہے کہ پورا پورا سال گزرنے کے بعد بھی طلباء ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوتے۔ کل تک ہماری یونیورسٹی جو ایک وحدت تھی آج اس میں ایک ہوسٹل کے رہنے والے طلباء بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔

ہماری یونیورسٹی میں سینیر اور جونیر کے تعلق میں بھی یقیناً زبردست خرابی تھی۔ لیکن یہ بھی نہ ہونا چاہیئے کہ یہاں کے سینیر طلباء کو یہ اختیار بھی نہ ہو کہ وہ نوواردوں کو یہ بھی بتا سکیں کہ بازاروں میں بغیر یونیفارم نہ جاؤ یا ہوسٹل میں اودھم [illegible] نہ مچاؤ۔ ہماری یونیورسٹی سے طلباء کا نام نہاد سینیر طبقہ ختم ہو چکا ہے لیکن کسی سینیر طالب علم کو محض اس لئے کہ وہ سینیر ہے حق بزرگی یقیناً حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اس کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ نئے طلباء سے کچھ کہہ سکے۔ (اس شرط کے ساتھ کہ وہ محض سینیر ہی نہیں بلکہ علی گڑھ کا سچا ہمدرد ہو) ظاہر ہے سینیر طلباء کے ہاتھ میں طاقت نہیں ہے کہ وہ بات منوائیں۔ پھر انہیں اس کا بھی ڈر ہے کہ اگر خاطر معصوم کو کوئی بات ناگوار گزری تو SHIFT نہ ہو جائے۔ اسی طرح طلباء میں آج آہستہ آہستہ ایک دیوار اٹھتی جا رہی ہے، ہمیں ڈر ہے کہیں یہ دیوار ناقابل عبور نہ بن جائے۔

طلباء کی آپس کی [illegible] دور کرنے کے لئے خود ہوسٹل ALLOTMENT الاٹمنٹ میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کبھی دو بھائیوں کو ایک ہوسٹل میں جگہ نہ ملتی تھی ایک کمرے میں تمام نئے طلباء نہیں رکھے جاتے تھے۔ بلکہ کچھ نئے اور کچھ پرانے رکھے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال تھا کہ ایک کمرہ میں دو مختلف علاقوں کے آدمی رہیں۔ لیکن آجکل عموماً بھائیوں کو ایک ہی کمرہ ملتا ہے۔ سب ایک علاقے کے لوگ مشترکہ طور پر ایک کمرہ لے لیتے ہیں اس طرح ان میں دوست تلاش کرنے اور دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے کی URGE ختم ہو جاتی ہے۔

ایک ہمارے ہاں غلط رواج ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کا پڑ گیا تھا جس کو شکر ہے اب یونیورسٹی ختم کر رہی ہے۔ ہمیں امید ہے اس کے مفید اثرات برآمد ہوں گے۔

اسی طرح اساتذہ اور طلباء کے درمیان بھی ایک خلیج آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ ہماری بدقسمتی سے یونیورسٹی کے اساتذہ کی ذاتی رنجش اور رقابت کا اثر طلباء کی ذہنیت پر بھی پڑتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بالآخر اپنے تئیں کسی ایک گروپ سے وابستہ کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کا نفسیاتی اثر [illegible] پڑتا ہے۔ کبھی کبھی طلباء اور اساتذہ کا تعلق جب وہ ڈیپارٹمنٹ سے باہر ہال میں یا مختلف کلبوں میں ملتے ہیں تو عہدوں یا رعایتوں کے لالچ میں حاکم و محکوم کا سا ہو جاتا ہے۔ طلباء CONCESSION لیکر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا فرض ہے کہ وہ خوشامد اور چاپلوسی کریں۔ کہیں کہیں یہ طلباء کی نفسیاتی کمزوری بھی کہی جا سکتی ہے مگر اکثر جگہ خود اساتذہ کا طرز عمل اس کی تلقین کرتا ہے۔

بہر حال جہاں ہمیں اپنے ادارے کے محاسن کا خیال ہے وہاں اس کے عیوب کی پردہ پوشی بھی غلط ہوگی۔ ہمارے مشرق میں طلباء اور اساتذہ کا تعلق مادی نہیں روحانی ہوتا ہے۔ مگر اس تعلق میں کوئی مادی دیوار حائل ہو جائے تو پھر آدمی کتاب پڑھ سکتا ہے لیکن فیضانِ علم سے محروم رہتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ارباب

یہ علی گڑھ ہے

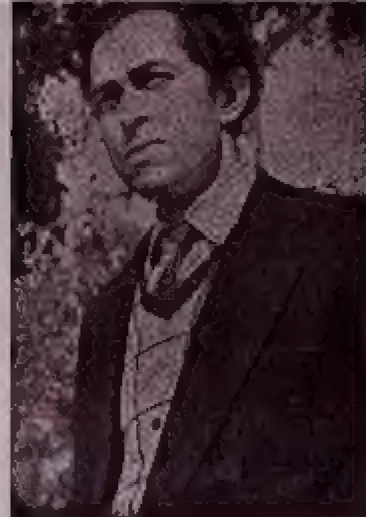
میرا داخلہ کل ہو چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک چٹ تھی جس پر میرا نام درج ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے ہوسٹل میں ایک کمرہ اور دو وقت کھانا دیا جائے۔ یہ چٹ لئے میں ہوسٹل کی تلاش میں نکلا ہی تھا کہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو میری ہی طرح سرگرداں تھے لیکن چونکہ انہوں نے ہوسٹل کے جائے وقوع وغیرہ کے بارے میں ضروری واقفیت حاصل کر لی تھی اس لئے مجھے یک گونہ سکون ہوا اور میں نے بے سوچے سمجھے ان کی پیروی قبول کر لی۔ ہم دونوں ہوسٹل کی تلاش میں چلتے رہے اور چلتے چلتے جب منزل مقصود پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو ایک جنگل ہے جہاں یہ ہوسٹل واقع ہے۔ ہوسٹل کی حد بندی کے لئے کسی دیوار کی ضرورت نہیں بس تین چار فٹ کی ایک دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ اندر جانے کا جو راستہ ہے وہ متعفن ہے۔ اندر بہت سے کمرے ہیں اور نئے کمروں کے لئے بھی کافی گنجائش ہے۔ ہر کمرے کا ساکن کچھ اس طرح محو سکوت ہے کہ پتہ کھڑکنے کی بھی آواز نہیں آتی اور نہ ہی ان کمروں میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہے یہ اندازہ لگانے میں ہمیں دیر نہیں لگی کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔ دل ہی دل میں اپنے رہبر کو دعائیں دیں۔ شہر خموشاں کے ساکنوں پر فاتحہ پڑھی اور واپس لوٹ آئے جب اصل منزل مقصود پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم نے ہوسٹل کی تلاش میں تین گھنٹے صرف کر دیئے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا ہے اور شام تک بھوکوں مرنا پڑے گا۔ غلطی اپنی تھی اس لئے چپ ہو رہے اور یہ عہد کر لیا کہ ہم میں سے کوئی اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔ (اور خدا جانتا ہے کہ آج سے پہلے کبھی یہ واقعہ زبان پر نہیں آیا)

غرض ہوسٹل میں میری شان نزول کچھ ایسی نہ تھی کہ فخریہ بیان کرتا۔ بے بال و پر شرماتا ہوا بھوکا پیاسا پہنچا تھا۔ خدا خدا کر کے شام پڑی۔ شام کو معلوم ہوا کہ مجھے جس کمرے میں ٹھہرنا ہے اس میں تین صاحب اور موجود ہیں اور ان میں ایک صاحب وہ بھی ہیں جو میرے "ہم فاتحہ" رہ چکے ہیں۔ ان پر بہت غصہ آیا لیکن پھر چپ ہو رہا کہ مشیت ایزدی یہی تھی کہ وہ اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک اٹوٹ سمبندھ میں جوڑ دیئے جائیں۔

اگلے دن صبح جب میں نہا دھو کر کل کا غم غلط کرنے نکلا تو ایک صاحب [illegible] کہنے لگے "صاحبزادے آخر یہ کہاں کا اخلاق ہے، دعا نہ سلام، منہ اٹھایا اور چل دیئے"۔ اس بے تکلفی پہ پہلے تو میں ہنسا پھر بولا کہ حضرت کہ دعا سلام میرا پیدائشی حق نہیں آپ بھی پہل کر سکتے تھے۔ وہ میری اتنی سی بات پر چراغ پا ہو گئے کہنے لگے میں [illegible] طبقہ سے ہوں میری بات وزن اور وقار ہی نہیں حکم کا پہلو بھی رکھتی ہے آپ پہلے شخص ہیں جس نے مجھ سے اس طرح بات کی ہے۔ آپ کو ٹریڈیشن معلوم نہیں اس لئے معاف کئے دیتا ہوں لیکن آپ آج شام ایک عرضی کے ساتھ وارڈن سے ضرور ملئے اور عرضی میں لکھئے کہ میرے نام ایک لیٹرین الاٹ کر دیا جائے۔ آپ ابھی تک دوسروں کے لیٹرین استعمال کر رہے ہیں کسی نے شکایت کر دی تو مفت میں جرمانہ ہو جائے گا۔ میں اس حیرت انگیز انکشاف پر بھونچکا رہ گیا اور ان کی ہمدردی کا شکریہ اور اپنی غلطی کی معافی مانگ کر سیدھا کمرے کی طرف لپکا، دوسرے ساتھیوں سے اس کا

(بقیہ [illegible])

مُرلی کی دُھن



لوک گیتوں کا مغنی اشتیاق علی گڑھ کا تنہا موسیقار ہے۔ وہ یہاں کا تنہا موسیقار ہی نہیں، علی گڑھ میں موسیقی کا جادو بھی سب سے پہلے اسی نے جگایا ہے۔ اسے یہاں کی تہذیبی زندگی میں ایک مقدس مقام دلایا ہے۔ محبت کے متوالوں کو مرلی کی دھن سے بہلنا سکھایا ہے۔ اس کے لئے اشتیاق کو کتنا ریاض کرنا پڑا ہوگا؟!

موسیقی ایک لطیف ترین فن ہے۔ اس کی اتھاہ پہنائیوں میں گم ہونے کے لئے ایک بے چین روح، ایک دھڑکتا ہوا سلگتا ہوا دل چاہئے۔ اس میں ڈوبنے کے لئے جسم و جان کی فربہی کافی نہیں، روح کے اضطراب کی ضرورت پڑتی ہے۔ نغمہ روح کے تاروں کی ایک وحشی جھنجھناہٹ ہے، یہ جھنجھناہٹ یونہی نہیں پیدا ہو جاتی۔ اس کے لئے آتش نفسی کی ضرورت پڑتی ہے۔ موسیقی اس سرزمین پر خدا کا بہترین شاہکار ہے، جو مادہ کے ماورا سوچ بھی نہیں سکتا۔ موسیقی اپنی مدھر لہروں کے سہارے اسے روحانی کیف و گداز سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ کافروں سے بھی ایمان کا لوہا منوا لیتی ہے۔ نغموں کے جسم داتا کو بیغیر ذہبی تو موحد تو ماننا ہی پڑے گا۔ معلوم نہیں اشتیاق نے اس آتش نفسی کو، روح کے تاروں کی اس جھنجھناہٹ کو محسوس کیا ہے یا نہیں، لیکن اس نے لوک گیتوں کی خوبصورت دھنیں ضرور پیش کی ہیں۔ ان میں اپنی دلنوازی سے جان ضرور ڈالی ہے۔

مجاز کی مشہور نظم "نذر علی گڑھ" جسے یونیورسٹی نے اپنا ترانہ بنالیا ہے، دراصل ترانہ بننے کے لئے اشتیاق کی مرہون منت ہے۔ اس نے اپنی موسیقی سے اس میں ایک سوز و ساز، ایک گداز پیدا کر دیا ہے۔ یا یوں سمجھئے ایک انشا پرداز کی زبان میں "لپٹی ہوئی بجلیاں بھر دی ہیں"۔ کون ہوگا جس نے اس ترانہ کو سنکر اپنے دل پر ایک چوٹ لگتی ہوئی محسوس نہ کی ہو۔ فن اگر اتنا جاندار نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

اشتیاق سے پہلے علی گڑھ میں کچرل شام کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس نے لوک گیتوں کی دھنیں بنائیں اور معروف گیتوں مثلاً ہولی، ملہار، رسیا اور دادرا وغیرہ کو ڈرامائی انداز میں فردوس گوش اور جنت نگاہ کے پورے لوازمات کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اب یہاں موسیقی کی ایک روایت قائم ہو گئی ہے اور اب کوئی بھی قابل ذکر پروگرام نغموں کی جھنکار سے خالی نہیں ہوتا۔

اشتیاق نے یونیورسٹی کو پہلی بار اس قابل بنایا کہ یہاں ایک فوک سونگ اینسامبل کی طرح پڑی، اور اس کے طفیل ہم اس قابل ہوئے کہ پورے جوش و خروش اور امنگوں کے ساتھ یوتھ فیسٹیول کے قومی مقابلوں میں حصہ لے سکیں۔ موسیقی کے ذوق کو عام کرنے اور اسے یہاں کی تہذیبی زندگی میں اعلیٰ مقام دلانے میں اشتیاق کا بڑا ہاتھ ہے۔ یونیورسٹی کم از کم اس کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

علی گڑھ کی سرد و خشک دنیا میں اشتیاق کے نغموں نے رومانوں کو جنم دیا ہے۔ اس سے پہلے یہاں کی ہواؤں میں نغمے کبھی نہیں گونجے تھے، کبھی مرلی کی دھن نہیں لہکی تھی۔ اس نے جس روایت کی طرح ڈالی ہے اسے آگے بڑھانا اور اس پر سبقت لے جانا علی گڑھ کا خوشگوار فریضہ ہونا چاہیئے۔

مرلی منوہر اگر اپنے نغموں سے دلوں کو نہیں موہ سکتا تو اس کا فن ادھورا ہے۔ لیکن اشتیاق نے بہتوں کا دل موہ لیا ہے۔ خود اس نے اپنی رادھا کا دل موہ لیا ہے اور اپنے فن سے اس مقولہ کی تصدیق پیش کی ہے کہ موسیقی محبت کو جنم دیتی ہے، اور محبت موسیقی کا ایک کومل روپ ہے۔ اشتیاق نے موسیقی کا یہ روپ دیکھا بھی ہے اور پرکھا بھی ہے۔

لیکن ابھی تک اشتیاق کی حیثیت متعین نہیں ہوئی ہے۔ نہ اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا جو اسے علی گڑھ کی محدود دنیا سے نکال کر ان سربلندیوں تک اٹھا سکتا جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ وہ ایک مغنی ضرور ہے، آتش نفس مغنی نہیں۔ اس کے راگ میں وہ بات بھی نہیں آئی جس سے بجھے ہوئے چراغ جل جاتے، نہ وہ تاثیر پیدا ہوئی ہے جو پتھر کا جگر چیر دیتی ہے۔ اس کی آواز میں شعلہ کی سی لپک بھی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ وہ ایک موسیقار ہے، لیکن موسیقی کے دیوتا نے ابھی اس پر وحی نہیں اتاری ہے۔ اُسے اس وحی کا منتظر رہنا چاہیئے۔ مرلی منوہر کو اس کی رادھا مل گئی ہے۔ اب اس کا فن رکنا نہیں چاہیئے، آگے بڑھنا چاہیئے۔

بقیہ صفحہ: ممبر بن سکتے ہیں تو کیوں ویمنس کالج کو باہر رکھا جائے۔ ویمنس کالج کے الحاق سے نہ صرف یونین کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ یونین میں لڑکیوں کی صرف DECORATIVE حیثیت بھی ختم ہو جائے گی۔

"علیگ" پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ یونین کے دستور میں ترمیم کے سلسلے میں اپنی رایوں سے مطلع کریں تاکہ وہ "علیگ" کے اگلے شمارہ میں شائع کیا جا سکیں)

---

۲۹ اگست کو ایس ایف کا افتتاحیہ جلسہ میرس ہال میں منعقد ہوا۔ پروفیسر حبیب نے ایک دلچسپ اور پُرمغز تقریر کی۔ اس موقع پر اشتیاق خاں اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ ترانے کے علاوہ چند گیت بھی پیش کئے۔ افتخار عالم خاں کا لکھا ایک ڈرامہ بھی

یہ پندرہ دن

یونین میں نئے طلباء کا استقبال

۱۰ اگست کی شام کو یونین کی طرف سے نئے طلباء کو خوش آمدید کہا گیا۔ ایکٹنگ صدر یونین نے نئے طلباء کو یہاں کی روایات سے روشناس کرایا۔ اور شیخ الجامعہ سے ان دقتوں کا ذکر کیا جو طلباء کو عام طور پر پیش آتی ہیں۔

شیخ الجامعہ نے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان تمام دقتوں اور مشکلات سے واقف ہیں جن کا ذکر صدر یونین نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا جن چیزوں کی طرف صدر نے اشارہ کیا ہے وہ ان کے علاوہ بھی بہت سی مشکلات سے واقف ہیں۔ زیدی صاحب نے یقین دلایا کہ وہ جلد ہی ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر میں انہوں نے کہا "میں بساط ہوائے دل کے تازہ واردوں کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتا ہوں۔"

استاد اور ہم

ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہمارے پچھلے شمارے کے ایک اداریہ میں ہم نے جو زبان اپنے ایک استاد کے لئے استعمال کی وہ استعمال نہیں کرنی چاہئے تھی۔ ہم کسی کو DEFAME کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارا مقصد صرف ایک TREND پر تنقید کرنا تھا لیکن یہ تنقید ضرورت سے زیادہ سخت ہو گئی۔ ہمارا طرز کلام بہتوں کو برا لگا اور بعد میں خود ہمیں برا لگا۔ ہمیں اپنی تلخ کلامی کا افسوس ہے اور اس کے اعتراف میں ذرا بھی باک نہیں۔ دراصل وہ اساتذہ اور طلباء کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے خلاف لڑنے کے لئے تازیانہ تھا یہ تازیانہ اگر استاد پر پڑا تو ہمیں اس کا قلق ہے۔ یہ صورت حال بہر صورت افسوسناک ہے کہ طلباء اور اساتذہ ایک دوسرے کے مسائل سے اس طرح بیگانہ ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا چاہئے ایک دوسرے کے مسائل میں دلچسپی لینی چاہئے۔ یہ اگر نہیں ہو رہا ہے تو ہونا چاہئے اس کی تلقین اور اس سے زیادہ اسے عملی زندگی میں کر کے دکھانا طلباء اور اساتذہ دونوں کا فرض ہے ہم سب کو سر جوڑ کر سوچنا چاہئے کہ اس کے سادھن کیا ہوں گے اور کس طرح ہم ان ناخوشگوار حالات کو پیدا ہونے سے روک سکتے ہیں۔

ہمارا ایک عزیز ساتھی رگھوناتھ م (دوی ایم ہال) ۲۰ ستمبر کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔ خدا مرحوم کی روح کو تسکین دے — ہم مرحوم کے غمزدہ والدین کے غم میں شریک ہیں۔ خدا انہیں صبر عطا فرمائے۔

یوم اردو

۲۵ اگست کو یونیورسٹی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی یونیورسٹی شاخ کی جانب سے یوم اردو منایا گیا۔ یونین ہال میں شام کو ایک جلسہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی زیر صدارت ہوا جس میں ایک قرارداد پاس کی گئی قرارداد میں کہا گیا ہے۔

"یہ جلسہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اردو ایک جدید ہندوستانی زبان اور ملک کی قومی زبانوں میں سے ہے۔ یہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کی ایک قابل فخر یادگار ہے .... اس کے بولنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والے ہمارے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور خصوصاً دہلی، اتر پردیش اور بہار میں قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں۔ دفاتر، عدالتوں، علمی کاموں اور تعلیم کی ہر منزل کے لئے اس کا استعمال ہوا ہے۔ ہندی، انگریزی اور بنگالی کے بعد سب سے زیادہ اخبار اس زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو بولنے والے ملک کی سب سے بڑی لسانی اقلیت ہیں جن کی تعداد ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے بھی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ہے۔

.... یہ جلسہ صدر سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دہلی، اتر پردیش اور بہار میں دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو اردو رسم الخط میں سرکاری اور علاقائی زبان قرار دیں۔ تاکہ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اردو میں ہو سکے اور عدالتوں، دفاتر اور سرکاری اعلانات میں اردو کا بھی استعمال ہو اور اس طرح اردو داں طبقہ کو قومی زندگی میں پورا حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

نیز یہ جلسہ پنجاب، آندھرا، بمبئی، راجستھان، مدھیہ پردیش، میسور، مدراس اور کلکتہ میں بھی اردو بولنے والوں کے لئے سہولتیں فراہم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔"

تھیالوجی ڈپارٹمنٹ میں تقریریں

۸ ستمبر سے ۱۴ ستمبر تک ۸ بجے شب کو ام نذیر احمد روڈ تھیالوجی ڈپارٹمنٹ میں جہلم کے سلسلے میں اسلامیات پر تقریریں ہوں گی۔ بروز جہلم ۱۶ کو صبح ۸ بجے تقریر ہوگی تمام حضرات سے استدعا ہے کہ وہ شرکت کریں۔

سید علی الکاظم آبادی سکریٹری تھیالوجی سوسائٹی

بقیہ صفحہ ملایا اور اس کے مسائل

یہ مسلح بند تحریک ایک عظیم شکل اختیار کر گئی تھی جو ظاہر ہے کہ ملایا کے عوام کی ہمدردی کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ جنرل ٹیمپلر جیسا "سامراجی جانباز" بھی عوام کی اس تحریک کا مکمل طور پر استیصال نہیں کر سکا۔ برطانیہ نے سالانہ لاکھوں پاؤنڈ اس کے خلاف خرچ کئے لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ اخراجات عوامی تحریک اور دوسری

۴ پریشانیوں کی وجہ سے برطانیہ ملایا کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک فائدہ یہ تھا کہ ملایائی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ عناصر کا تصادم کمیونسٹوں سے ہوگا جسے برٹین اپنے حق میں استعمال کرے گا۔ اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ انہیں اس بات پر راضی کیا ہے کہ برٹین فوجیں ملایا میں رکھ سکتا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا یہ فوجی اڈے کب تک رہیں گے۔ برطانیہ کو دی ہوئی فوجی سہولتیں ملایا کی آزادی ترقی اور قومی زندگی میں ضرور حائل ہوں گی۔ ملایا کی کمیونسٹ پارٹی سمجھوتے کے لئے تیار ہے کیونکہ ہتھیار بند کارروائی ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف تھی۔ اب ملایا آزاد ہو چکا ہے لیکن چونکہ فی الحال ملایا کی سیاسی باگ ڈور رجعت پسند اور جاگیردارانہ عناصر کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا وہ کمیونسٹوں سے سمجھوتہ کر کے اسے ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے سیاسی میدان میں دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ انہیں تخریبی عنصر کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک خاص طبقہ کو اپنا مفاد خطرے میں معلوم ہوتا ہے

ایڈیٹر کی ڈاک

ایڈیٹر صاحب "علیگ"

مجھے یقین ہے کہ آپ کے نامہ نگار خصوصی نے آپ کو مطلع کیا ہوگا کہ ۲۱ اگست کی شام یونین کی ویل کم میٹنگ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب کرنل بشیر حسین صاحب زیدی نے اپنی تقریر میں جہاں یونیورسٹی میں تعمیر و ترقی کے مختلف منصوبوں سے طلباء کو روشناس کرایا وہاں آخیر میں خصوصی طور سے علیگڑھ کی امتیازی شان کا بھی کھول کر تذکرہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ایک زمانہ تھا کہ علی گڑھ کے طلباء ہندوستان کے کسی بھی مقام پر کسی بھی موقع اور مجلس میں اپنی پوشاک گفتار اور کردار کی نمایاں خصوصیات کی بناء پر فوراً ہی پہچان لئے جاتے تھے۔ ہماری وہ قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں، ہم میں دوسرے اداروں کے طلباء میں کوئی نمایاں خصوصیت باقی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے محترم زیدی صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔ امتیازی شان رہ بھی کس طرح سکتی ہے؟ ساری یونیورسٹی میں لے دے کر یونین ہی ایک ایسا ادارہ تھی جہاں ہم اپنی روایات کو جو بہت اچھی تھیں اور جن پر ہم بجا طور پر ناز کرتے آئے ہیں، برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مکمل پوشاک اور گفتار کا سلیقہ برتتے آئے ہیں۔ اب ان معاملات میں ڈھیل برتی جاری ہے۔ سکتے دکھ کی بات ہے کہ زیدی صاحب کے اتنے اہم اور اس قدر واضح اشارے کو صاحب کرسی نہ سمجھ سکے یا سمجھنا نہیں چاہا۔ اور فوراً ہی یونین کے ڈائس پر وہ منظر پیش کر دیا جس کا شکوہ زیدی صاحب نے کیا تھا۔

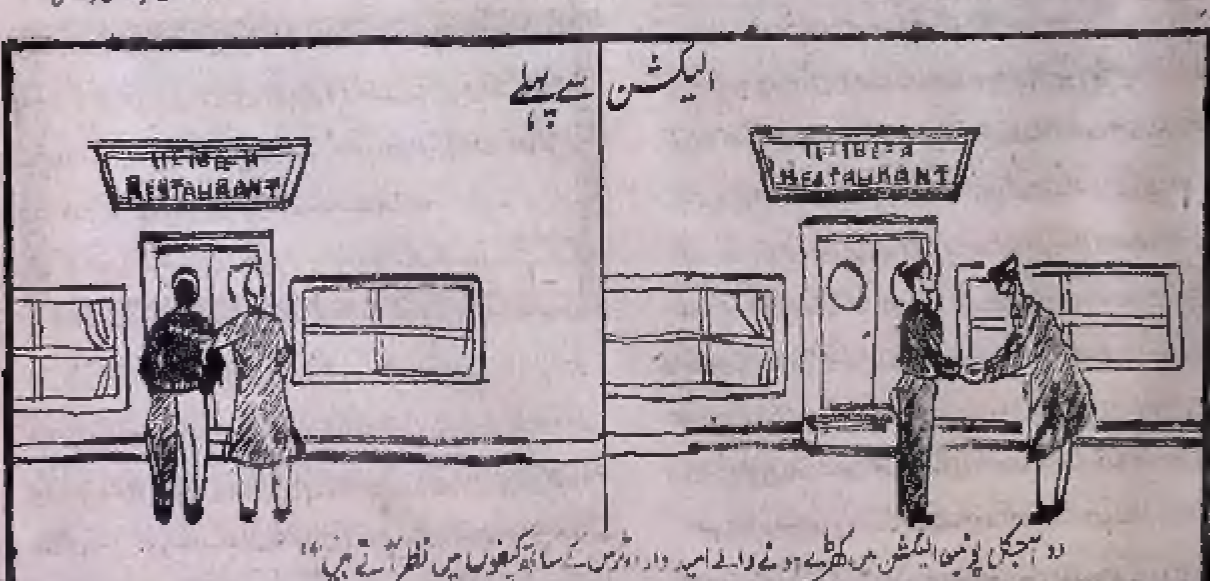
گستاخی معاف! ہمارے سکریٹری صاحب (جو کسی نامعلوم اتفاق کی بناء پر مجبوراً ایکٹنگ صدر تھے) علی گڑھ کے بہت پرانے طالب علم ہیں۔ یونیورسٹی اور یونین کی روایات اور ضوابط سے بخوبی واقف تھے۔ پھر نہ معلوم کیوں ترانے پڑھنے والے ساتھیوں کو لباس کی طرف تاکید نہ کر سکے۔ ہم اپنے نئے ساتھیوں سے کس اعتماد اور بھتے پر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری یونین کی یہ روایات ہیں اور یہاں بولنے اور سننے کے یہ آداب ہیں۔ جبکہ ہم نے پہلے ہی دن ان کے سامنے یہ غیر روایتی اور غیر دستوری منظر پیش کیا۔ ترانے کا احترام کرنا چاہئے۔ جلسوں کو کامیاب بنانے کا آسان نسخہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

کرتے ہیں ہے!　　　　رشادہ عبدالقیوم آفتاب ہوسٹل

ایڈیٹر صاحب علیگ

علیگ میں آپ کا لکھا ہوا مضمون بعنوان "ایک عرض تمنا" پڑھ کر یہ خیال آیا کہ آپ نے یونیورسٹی کے لئے ایک بس کی رائے پیش کی لیکن آپ Women's college کو بالکل بھول ہی گئے۔ وہاں پر ایک بس کی اشد ضرورت ہے۔ شہر کے ایک معمولی کالج میں دو دو بسیں چلتی ہیں مگر یونیورسٹی کے کالج کے پاس ایک بھی بس نہیں۔ شہر سے جو لڑکیاں پڑھنے آتی ہیں وہ ٹوٹے پھوٹے تانگوں میں آتی ہیں۔ سول لائن میں بھی جو لڑکیاں رہتی ہیں ان کو رکشا یا تانگہ کا انتظام کرنا پڑتا ہے اگر یونیورسٹی کی بس ہو تو ان کو خرچ بھی کم پڑے اور لڑکیاں بہت اطمینان سے کالج تک پہنچ جایا کریں۔ یونیورسٹی میں جو FUNCTIONS ہوتے ہیں ان میں لڑکیوں کو آنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کالج کتنی دور ہے۔ معلوم نہیں کہ اس طرف لوگوں کی توجہ کیوں نہ گئی اور گئی تو اس پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔

جب غیر ممالک کے لوگ دہلی آتے ہیں تو اکثر بذریعہ کار آگرہ جاتے ہیں۔ وہ لوگ علی گڑھ ہو کر گزرتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہاں یونیورسٹی بھی ہے اگر ان لوگوں کو معلوم ہو تو اسے دیکھنے ضرور آئیں کیونکہ ان کا مقصد ہی ہندوستان دیکھنا ہوتا ہے۔ اگر نہ بھی آئیں تو کم از کم ان کو معلوم ہو جائے کہ یہاں یونیورسٹی ہے غیر ممالک کے لوگوں کو چھوڑیئے خود ہندوستان کے بہت سے شہروں سے جو لوگ بذریعہ کار دہلی جاتے ہیں ان کو علی گڑھ راستے میں پڑتا ہے مگر ان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یونیورسٹی کدھر ہے اکثر یہ انتظار ہی کرتے رہتے ہیں کہ شاید یونیورسٹی نظر پڑے کہ وہ علی گڑھ کی سرحد بھی پار کر جاتے ہیں۔ اگر یونیورسٹی جی ٹی روڈ پر جگہ جگہ سائن بورڈ لگوا دے تو میرے خیال سے بہت سے لوگ روزانہ یونیورسٹی دیکھنے آئیں گے۔ اور اس چمن زار کو دیکھ کر ضرور خوش ہوں گے۔ جتنی سڑکیں جی ٹی روڈ سے یونیورسٹی کی طرف آئیں ان سب پر بڑے بڑے سائن بورڈ ہونا چاہئیں تاکہ انجان لوگوں کو راستہ ڈھونڈھنے میں دقت نہ ہو۔ یونیورسٹی کی ہر عمارت اور ہر ڈپارٹمنٹ پر اس کا نام ضرور لکھا ہونا چاہئے۔
جمیل مرتضیٰ سیکنڈ ایئر ہوسٹل



"وہ جیکی یونین الیکشن میں کھڑے ہونے والے امیدوار دوسروں کے ساتھ کیفوں میں نظر آتے ہیں"

علی گڑھ میں دو دن

(مسلم عباسی بی اے علیگ)

۲۹ر جولائی ۱۹۵۷ء کی صبح کی ٹرین سے وارد علی گڑھ ہوا۔ اسٹیشن سے فیض گیٹ تک ساری فضا کو چار سے عزب یا یادِ صحرائے کالج مبدل بہ کفِ گل فروش دو دامان بامان تھا۔ لگی ہوئی عمارتوں کی پیشانیوں پر سدا بہار کر پرس کے چہرے پڑے ہوئے تھے۔ تہذیب و اخلاق کی دنیا اپنی جگہ پر تھی۔ ممبران اسٹاف، طلبار اہلکاران کالج سے لیکر چپراسیوں تک علی گڑھ کی قدیم روایات کے حامل نظر آئے کسی قسم کے شور و شغب دھکم دھکے یا بدنظمی کی کوئی مثال نظر نہیں آئی۔ انسانوں کے متحرک وجود کے ساتھ ساتھ جہانِ نباتات کے بوقلموں نمونے بھی اسی دائرے میں قدم رکھتے ہوئے نظر آئے اور بقول ریاض مرحوم

بہار آتے ہی گلشن میں بچھا دی چھائی مڑ کر ڈھونڈھنے سے ہرا آشیاں نہیں ملتا

کی شکایت لب پر تھی۔ حبیب احمد سلانے میرے لڑکے معتصم کے ایڈمیشن کے سلسلہ میں ہر سر آفس کی زلفوں کو سلجھانے میں مدد کی۔ "کار زمین" انجام کو پہنچا تو "آسمان منزل" کی پرداخت اختیار کی۔ چند گردشوں نے مجھے یہاں استاذ المحترم شیخ عبدالرشید کی قدمبوسی کا موقع دیا۔ ایک مختصر سے تعارف کے بعد حضرت نے اپنے قدیم خلق و مدارات کی تاریخ دہرائی۔ پکی بلڈنگ سے نکل کر "عثمانیہ کی سرزمین بھی ہو نے چہارم آسمان پائی۔ اقبال کا یہ مصرعہ گنگنانے لگا ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پروسٹ آفس "ٹول ہاؤس" کی بلندیوں پر پہنچا کر ہی ایڈمیشن کی آخری منزل تھی۔ اس صوبے میں مجھے ایرانی، تورانی، افریقی، اندونیشیائی، سوڈانی، چینی اور نیپالی قریب سے دیکھنے کو ملے۔ ان کے رنگ و نسل کا راز اگر آپس کی گفتگو سے افشانہ ہوتا تو وضع و لباس حرکات و سکنات سے اس کا اظہار ناممکن تھا۔ ان کی تربیت و اخلاق کا یہ عالم کہ ہنس ہنس کے بود و باش پوچھنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا ایک نیپالی پیکرِ شرافت نے میرے ساتھ دو دن گزار دئے لیکن کسی قسم کے تشبیبِ فراز کا ایک دوسرے کے تمدن میں امتیاز نہ ہوا۔ آگے بڑھا تو سلطان جہاں منزل یا کانفرنس ہاؤس کے قلمی کتبخانے کی زیارت ہوئی۔ یہیں کا دشوں کے ثمر سبحان اللہ خاں لائبریری کے دن پھلے ہوئے نظر آئے۔ گورکھپور کے فخر کے سر کو اونچا کرتا ہوا فردوس نظر نسخوں کا الماریوں میں مشاہدہ کرتا جاتا تھا۔ اور یہ شعر لب پر تھا۔

صاحب زید جو تھے صحن ارم تک پہنچے　　ہم سیہ کار تھے دامان کرم تک پہنچے

مرحوم کی علم دوستی کی ابتدا خدا بخش خاں لائبریری کو دس ہزار کا چندہ دیکر ہوئی تھی جب ان کی عمر دس سال کی تھی اور انتہا اپنے اس سرمایۂ حیات کو داخل علی گڑھ کر کے ہوئی۔ بقیہ ان کی ریاست کا چپہ چپہ گوشہ گوشہ ملک کشو ڈین کی نذر ہو گیا۔ کانفرنس ہاؤس سے نکل کر میں گورکھپور کی روح رواں ہستی خیر صبوری سے ملا جو انجمن ترقی اردو کے جسد کا قفس میں قید ہیں۔ اسی اثنا میں سردار جعفری صاحب کا استقبال خیر صاحب نے ایک مشت دو انگشت کرسی سے اٹھ کر کیا۔ یہ حضرت جیسے زمانہ کالج میں ڈالیوں پر اور آشیانوں میں آچکے تھے۔ لیکن پر و بال نہیں آئے تھے اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میرے قدیم کرم فرما ڈاکٹر عزیر صاحب بسترِ علالت پر دراز متفکر و مضطرب ہوں گے۔ فرشتوں جیسی صورت ہو گئی ہے یہ وہی انسان ہیں جو میاں پلورب غازیپور کے گرد بیان "مقیم جمنز منزل کے ساتھ" "دور دیہاتی" میں علی گڑھ آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ آہ ادریس عالم مرحوم امیر جماعت منیر صاحب باغ جن کی مرگ بے ہنگام نے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ توڑتا ہے گل کو گلچیں توڑتا جنجار کو سڑک کے دوسری طرف شمشاد مارکیٹ کی نئی نویلی دلہن کا لٹنا ہوا سہاگ دیکھا۔ نظروں کے سامنے صرف اللہ کا گھر اور دل میں اس کی تسبیح تھی۔ اسکے متصل صاحبزادے صاحب کے اقبال کا گہنا ہوا آفتاب ان کی ویران کوٹھی جو میرے زمانے میں جاہ و جلال، ترقی و عروج کے خورشید کا خط استوا تھی نظر آئی۔ اتنے میں ہاسہ زمانہ کے جنم روگی ڈائننگ ہال کے طبیب حاذق پروفیسر حاذق صاحب کی کوٹھی کا پتہ چلا جنہوں نے بسکٹوں کی فیکٹری پر اکتفا کر کے اس کی پشت پناہی اختیار کر لی ہے۔ حاضر خدمت ہوا لیکن ایک طفل چار دہ سال ہم شبیہ حاذق پر اکتفا کرنا پڑا۔ موصوف عصر و مغرب کے فریضۂ نماز کے سلسلہ میں اندرون خانہ جا چکے تھے۔

میری زیارت گاہوں میں جمال پچھش اور منٹو سرکل قابل ذکر ہیں ان میں میری زندگی کے کئی سال گذارے ہیں۔ اس دنیا میں فرسودگی اور بوسیدگی کا سبب پانی کے نلوں کے سامنے غسل کرتے ہوئے ننگ دھڑنگ مکینوں کا اجتماع ہے۔ بہر کیف زبان پر یہ شعر تھا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　"منٹو سرکل" دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے اس مختصر سے عرصۂ قیام میں چمن کی ظاہری رونق اور رنگا رنگ پھولوں کی توانائی کو خوب دیکھا۔ گلوں کی دلکشی اور دلوں میں روشنی کم نظر آئی۔ یہی شکوہ پہلے بھی تھا اب بھی کالج کی انگلیوں کی مشتریاں "مسجدوں کے نگینوں کی تڑپ چشم ناظر کو خیرہ کر رہی ہے لیکن افسوس "کالج میں بہت سے سجدے بھی فقط جبیں" کا شکوہ بے کار خصوصاً تار والے بنگلے کے سر کا تاج جدید فن معماری کا شاہکار مسجد جس میں یوسف گم گشتگان کالج کے منتظر ہزاروں دیدۂ یعقوب کھلے ہوئے ہیں۔ اور فرش مرمریں جا بجا ست کہکر دامن دل کھینچتا ہے، زبانِ حال سے شکوہ کناں ہے۔

کیوں ہم نہ کہتے تھے دیکھا نہ آئے

اب میں چند ان شمع علم حضرات سے ملا جو اپنی عمر طبعی کو پہنچکر کبھی ہنس کر اور کبھی رو کر دن کاٹ رہے ہیں۔ رشید احمد صاحب صدیقی سے علالت نے عذر پیری دیکھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ ایک جوان جہاں کوٹھی میں وہ فروکش ہیں اور اس کی خاک کریدکر کر گنجہائے گراں مایہ سے جیب و دامن بھرتے ہیں جب میں حاضر ہوا تو وہ سر نگوں "بکھ لاڈ کل" سے شغل فرما رہے تھے۔ دوسرا انجیر حمیدالدین خاں صاحب کا تھا۔ ان کی پیری کا عہد شباب کے بجائے ماشاء اللہ پیری دلفریب مجھے نظر آئی۔ بیابانِ کالج سے سبکدوش ہو کر اب یہ گلستان در آغوش و بوستان بہ کنار اپنی طرز بالا دیوار دل سے مصور کوٹھی میں ایک صاف ستھری بے خلل و غش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ علوی صاحب مخلط خیر رانی میں ڈپارٹمنٹ سنبھالے ہوئے نظر آئے۔ ان کے شباب کا سونا تو چکا ہے چاندی نکل آئی ہے۔ ضیا احمد صاحب پر جو نظر پڑی تو وقت کی رفتار

ٹھیری ہوئی سی معلوم ہوئی صحت ماشاءاللہ اپنی جگہ پر ہے صرف داڑھی کا اضافہ ہے۔ وضع و تراش میں وہی سادگی امزاج کے انکسار میں یکسر بھی فرق نہیں۔ ان بزرگوں سے دفتاً فوقتاً میں نے عرض کی کہ ماشاءاللہ کالج اب مالی مشکلات میں ڈیوٹی ڈپوٹیشن کا محتاج نہیں۔ لیکن ملک و قوم سے بے نیازی اچھی نہیں اب گوشے گوشے میں اچھے لڑکوں کے تجسس کا وقت آگیا ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا جادو جگائیے۔ مشرقی علوم کے کبھی نہ ملک میں ردیوں کے بھاؤ بک رہے ہیں۔ ان کو سمیٹ لائیے۔ انجمن ترقی اردو کا داخلہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے احرام میں ہو گیا ہے خدا خیر کرے۔ اس مریض کے لئے مجرنظامات کا سفر اختیار کیجئے۔ اس کی ردیاں بازار بھاؤ سے بچا لیجئے "علی گڑھ کے بھاؤ" سے کب تک بکتی رہیں گی مجھے شبہ ہے کہ کہیں "قبر بلبل کی بنے گلزار میں" کا سامان تو نہیں ہو رہا ہے۔

دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ باد یہ گرد پیٹ بھر لیتی تھی اور تن ڈھانک لیتی تھی، خدا کی ہوا اور روشنی میں بے پروا خرام زندگی بخش تھا۔ قید حیات و بند غم سے آزاد تھی لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کا نان نفقہ حکومت سے حاصل کرکے سپرد ڈانگ بال کر دیا جائے اور گنی بوٹیوں اور سٹے شوربے پر بسر ہونے لگے۔ قوم و ملک کے ادیبوں اور زباں دانوں کے کان کھڑے ہیں کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" کہیں اس کا حشر اکبر کے ٹرمی چند دن کا نہ ہو کہ — "کالج لے گیا کہ تو ندمیں ہوں"۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ۸۰ فیصدی طالب علموں کو کسی نہ کسی شکل میں کالج مالی امداد سے نوازتا ہے۔ اہل ملک کان کھول کر سن لیں کہ زمانہ کی اس نئی کروٹ کا مطالبہ اب یہ ہے کہ اس یونیورسٹی میں کثرت کے ساتھ بابر مرزا، محمد حبیب اور ڈاکٹر ہادی حسن پیدا ہوں۔ ہندوستانی اقوام مغرب کی ہم عنگی اور ہمسری کا عزم بالجزم کئے ہوئے ہیں کہ بغیر اس کے مفر نہیں۔ دنیا کی مادی ترقیوں کے لئے ہمیں سائنسدانوں کی تلاش ہے۔ ملک میں ڈاکٹروں، انجینیروں کی بڑھتی ہوئی مانگ ہے۔ "حدیث مطرب" کا وقت نہیں اس کالج میں داخلہ کی سیڑھیاں پہلے صرف زرداری اور سرمایہ داری ہوا کرتی تھیں "علیگ" ہونا سوسائٹی میں ایک وقعت کا سامان ہوا کرتا تھا لیکن اب ہم جدید العقا کے ایٹمی دور میں داخل ہیں۔ اس بیچ رواں دواں زندگی میں ایسا نہ ہو کہ بھاری ٹینکوں اور ہواؤں سے باتیں کرنے والے طیاروں سے مسلح جوق در جوق افواج ہمارے خوابیدہ جسموں کو روندتی ہوئی گزر جائیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

بقیہ صد۲: یہ علی گڑھ ہے

ذکر کیا تو ان سب نے مکرخیال کی تائید کی، میں نے بھی اسی میں بہتری سمجھی کہ اپنے بزرگوں کا کہا مانوں اور آنے والے خطرے سے محفوظ ہو جاؤں۔

شام کو جب وارڈن صاحب آئے تو میں مع ایک عدد عرضی کے ان کے کمرے میں داخل ہوا داخل ہونے کے بعد جو کچھ گزری اس کے لئے نہ میرے پاس الفاظ ہیں نہ دل و دماغ کہ آپ کو سنا سکوں ہاں جب کمرے سے نکلا تو میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وارڈن کے کمرے سے فلک شگاف قہقہوں کی آواز میرے کانوں کے پردے چیرے ڈالتی تھی۔

کچھ یونین کے دستور کے بارے میں

(شاہد مہدی)

یونین کو ہماری یونیورسٹی کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن پچھلے چند سالوں کے تجربات اور مشاہدات نے ہر سوچنے اور سمجھنے والے طالب علم کو یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کر دیا ہے کہ یونین کو ہماری اقامتی تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں جو مقام عملی طور پر حاصل ہونا چاہئے حاصل نہیں ہے۔ اس نتیجہ کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے۔ اس تدریجی تنزل کے کئی اسباب ہیں یہاں ان تمام اسباب کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں بلکہ سیدھی سادی اردو میں اس کے تدارک کے اقدام کا بیان کافی ہوگا۔

آج سے چھ سال قبل ۱۹۵۱ء میں یونین کے دستور کو تبدیل کرکے موجودہ شکل دی گئی تھی۔ آج یونین کے ذمہ دار حضرات اس دستور میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ چند دنوں کی بات ہے کہ انھیں ارباب حل و عقد نے طلباء کی ایک مشاورتی میٹنگ بلا کر یونین میں لائبریرین کا عہدہ ختم کرنے اور نائب صدر کے نئے عہدے کی تجویز پر غور کیا تھا۔ اب جبکہ یونین کے آئین میں ترمیم کے متعلق سوچا جا رہا ہے اور پچھلے سالوں کے تجربوں اور مشاہدات سے نتیجے اخذ کئے جا رہے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہمیں اور کس قسم کی آئین میں ترمیم کی ضرورت ہے جس سے ہماری یونین کی مرکزی حیثیت بھی قائم رہے اور اسے ہماری اقامتی تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل رہے۔ یونین کے دستور میں ترمیم کے لئے چند تجاویز ہیں جن پر ہم سب کو سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔

۱۔ یونین کے صدر، نائب صدر اور سکریٹری کا انتخاب براہ راست ہو۔

۲۔ کیبنٹ کی جگہ ایک کونسل ہو جس میں نمائندوں کی CONSTITUENCIES ہوں۔ ہر سو طلباء پر ایک نمائندہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر V.M.HALL میں پانچسو طلباء رہتے ہیں تو ان کے پانچ نمائندے UNION COUNCIL کے ممبر ہوں۔ اس طرح ہر ہال سے طلباء کی تعداد کے مطابق نمائندے چنے جائیں جن کا انتخاب ہال کے طلباء کریں۔ اس تجویز میں منجملہ کئی اور فائدوں کے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر ہال کو مناسب نمائندگی کا موقع ملے گا اور اس طرح منتخب شدہ نمائندے ہماری موجودہ کیبنٹ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نمائندہ ہوں گے۔ تیسری بات یہ کہ الیکشن کے مصارف میں بہت کمی ہو جائے گی۔

۳۔ صدر کونسل کے لیڈر کو جس کی کہ کونسل میں اکثریت ہوگی دعوت دے گا کہ وہ یونین کے مختلف PORTFOLIO کے لئے کونسل کے ممبروں میں سے دس ممبروں کے نام پیش کرے۔ یہ دس ممبر ملکر یونین EXECUTIVE بنائیں گے۔ EXECUTIVE کے ممبروں کی تعداد کو ضرورت کے لحاظ سے کم اور زیادہ کیا جا سکے گا ——— اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ یونیورسٹی کی موجودہ سیاسی فضا کے مطابق کسی ایک گروپ کی EXECUTIVE نہیں بن سکے گی اور لازمی طور پر COALITION وجود میں آئے گا۔

۴۔ کیا وجہ ہے کہ جب انجینیرنگ کالج، طبیہ کالج وغیرہ کے طلبہ ہماری یونین کے

بقیہ صد۳ کالم ۱

ملایا اور اس کے مسائل

(اے۔ جان قیصر)

۳۱ر اگست ۱۹۵۷ء کو ایشیا کا ایک غلام ملک ملایا قانونی طور پر برٹش سامراج سے دولت مشترکہ کی ممبر شپ کے ساتھ آزاد ہو گیا۔

دستور کے مطابق ملایا گیارہ ریاستوں کا ایک فیڈریشن ہے۔ یہ اسلامی ریاست بنایا گیا ہے اور اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ ریاست کا ہیڈ گیارہ ریاستوں کے سلطانوں میں سے کسی ایک کو دو سال کے لئے چن لیا جائے گا۔ یہ چناؤ وہ سلاطین خود کریں گے اور ہر ایک سلطان کو باری باری سے ریاست کا ہیڈ بننے کا موقع ملے گا۔ ملایائی زبان میں ریاست کے ہیڈ کا ٹائٹل "یانگ ڈی پرچورن اگنگ" ہوگا۔

بھارت اور ملایا کی دستور سازی میں یہ بہت بڑا فرق ہے کہ بھارت کا دستور ملک کے نمائندوں نے ترتیب دیا ہے اور ملایا کا دستور غیر ملکی "ریڈ کمیشن" کی سفارشات پر ترتیب پایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دستور کے لحاظ سے ریاستوں کے وجود کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ہر ملک یا آزادی کے بعد ذمہ داریاں اور مسائل بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔ داخلی اور خارجی پہلوؤں سے ملایا کے مختلف مسائل میں سیاسی، معاشی اور نسلی پہلو خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ملایا کا نسلی مسئلہ کچھ یوں ہے کہ نسلی اعتبار سے ملایا کی آبادی چینی، ہندوستانی اور ملایائی پر معاشی اقتدار زیادہ تر چینیوں کے ہاتھوں میں ہے، پیشہ ور طبقہ میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ ہے اور ملایئوں کی اکثریت مزدوروں اور کسانوں میں ہے۔ ہر ایک کا مفاد جداگانہ ہے۔ ان تینوں نسلوں کا اتحاد، ملایا کی خوشحالی اور ترقی کا ضامن ہوگا۔ ہر ملک سے پہلے ان تینوں نسلوں کے اعلیٰ طبقوں نے باہم ملکر ایک ALLIANCE PARTY بنائی۔ برٹش حکومت کی سیاسی چال یہ ہے کہ DIVIDE AND RULE کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ان میں پھوٹ ڈال دے (یہی کوشش تو کامیاب ہو گئی یعنی دستور کی رو سے ملایا کو ایک اسلامی ریاست بنا دیا گیا۔ اور اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا) ایسے سازشوں اور چالوں سے ملایا کے عوام کو ہوشیار رہنا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ فوجی اور سیاسی معاہدوں کا ہے۔ سیٹو میں شمولیت کا مسئلہ ملایا کے لئے بڑا اہم ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے عوام اس کی مخالفت کریں گے اور چاہیں گے کہ ملایا کی خارجہ پالیسی بھارت کی طرح غیر جانبدار رہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا ملایا یو۔ این۔ او میں داخل ہونے کے بعد افریقی ایشیائی بلاک میں رہے گا یا مغربی طاقتوں کا ساتھ دے گا؟ یا پھر جاپان کی طرح یو۔ این۔ او میں درمیانی راستہ اختیار کرے گا؟ —— اس سلسلہ میں ایک بات قابل غور ہے کہ یوم آزادی کے موقع پر کمیونسٹ حکومتوں کو دعوت نامے نہیں بھیجے گئے تھے اس کے برعکس ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ایک نمائندہ خاص طور سے حاضر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات برٹش حکومت کے دباؤ یا ان کے زیر اثر ہوئی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ملایا کے عوام متحدہ ہو کر کس حد تک برٹش حکومت کے اثر سے بے نیاز رہ کر ایک قومی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔

یوں تو ملایا میں قدرتی وسائل کی افراط ہے لیکن اب تک ان وسائل کو اچھی طرح کام میں نہیں لایا گیا ہے۔ ملایا کی سب سے قیمتی پیداوار ربڑ ہے۔ اس ملک کا معاشی پہلو ربڑ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ربڑ کی کھپت کہاں ہوگی؟ امریکہ کو اس کی زیادہ ضرورت نہیں۔ انگلینڈ اچھا مارکیٹ مہیا کرنے سے قاصر ہے لازمی طور پر ربڑ کی کھپت، سیلون کی ربڑ کی طرح، صرف چین ہی میں کثرت سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سیلون کی راہ میں مغربی طاقتوں نے جو رکاوٹیں کھڑی کی تھیں وہ سب جانتے ہیں ملایا پر بھی چین کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے کے خلاف سیاسی دباؤ اور دھمکیاں کھڑی کی جائیں گی۔ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے لازم ہے کہ ملایا اس پالیسی کو اختیار کرے جو اس ملک کو معاشی ترقی اور سیاسی خوشگواری کی راہ پر لے جائے نہ کہ چند سامراجی طاقتوں کے مفاد کی خاطر اپنی آزادی کا گلا گھونٹے۔

معاشی اعتبار سے ملایا میں ابھی صنعتی ماحول کا فقدان ہے۔ اگر سنگاپور چند مہینوں میں آزاد ہو گیا اور ملایا فیڈریشن میں شامل کر لیا گیا تو ظاہر ہے کہ صنعتی اور جاگیردارانہ عناصر کا تصادم ہوگا۔ جدید تکنیک کے مطابق صنعتی عناصر کی فتح یقینی ہے۔ اس سے یہ مسئلہ کھڑا ہوگا کہ ان گیارہ ریاستوں کی کیا پوزیشن ہوگی؟ مستقبل میں سیاسی تبدیلیاں امر یقینی ہیں۔ فی الحال یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تبدیلیاں کیا صورت اختیار کریں گی۔

امریکہ کے وال سٹریٹ کے سوداگروں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی ہے۔ "وال سٹریٹ جرنل" نے امریکی سرمایہ داروں کو ملایا میں سرمایہ لگانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ملایا پاکستان، عراق وغیرہ کی طرح امریکہ سے معاشی امداد قبول کرے گا یا بھارت کی طرح غیر مشروط معاشی سمجھوتہ!

ٹینکو عبد الرحمٰن کا خیال ہے کہ ملایا کا سب سے بڑا داخلی مسئلہ "کمیونسٹ دہشت پسندوں" کا ہے۔ مختصراً قصہ یوں ہے کہ غیر ملکیوں کی حکومت کے خلاف ملایا کی کمیونسٹ پارٹی نے ہتھیار بند کارروائی بڑی مدت سے شروع کر رکھی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۲)

غزل

(معین احسن جذبی)

دانائے غم نہ محرم راز حیات ہم
دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دل کائنات ہم
ڈھونڈا کئے ہیں راہ ہوس رہزن شوق
دیکھا کئے ہیں لغزش پائے ثبات ہم
ہم خزاں سے کس کو مفر تھا مگر نسیم
کرتے رہے گلوں سے نکھرنے کی بات ہم
اے شمع دلبری تیری محفل سے بار ہا
لے کر اٹھے ہیں سوز غم کائنات ہم
ان کے غموں کا ہائے سہارا نہ پوچھئے
کچھ پا گئے ہیں اپنے غموں سے نجات ہم

(ظہیر احمد و عرفان اللہ نے مرتب کیا — نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر علیگ ۲۷ آفتاب ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا)